

تفسیر القرآن

یس

(۳)

۱؎ اِن لوگوں کے لیے بے جان زمین ایک نشانی ہے۔ ہم نے اس کو زندگی بخشی اور اس سے غلہ نکالا جسے یہ کھاتے ہیں۔ ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور اس کے اندر سے چشمے پھوڑ نکالے تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ پھر کیا یہ شکر ادا نہیں کرتے؟ پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ

۲؎ پیچھے دور کو عوں میں کفار مکہ کو انکار و تکذیب اور مخالفت حق کے اُس رویہ پر ملامت کی گئی تھی جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اختیار کر رکھا تھا۔ اب تقریر کا رخ اُس بنیادی نزاع کی طرف پھرتا ہے جو اُن کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کشمکش کی اصل وجہ تھی، یعنی توحید و آخرت کا عقیدہ، جسے حضور پیش کرتے تھے اور کفار ماننے سے انکار کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں پے درپے چند دلائل دے کر لوگوں کو دعوتِ غور و فکری جاری ہے کہ دیکھو، کائنات کے یہ آثار جو علانیہ تمہاری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، کیا اُس حقیقت کی صاف صاف نشان دہی نہیں کرتے جسے یہ نبی تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے؟

۳؎ یعنی اس امر کی نشانی کہ توحید ہی حق ہے اور شرک سراسر بے بنیاد ہے۔

۴؎ اس فقرے کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: "تاکہ یہ کھائیں اُس کے پھل اور وہ چیزیں جو ان کے اپنے ہاتھ بناتے ہیں، یعنی وہ مصنوعی غذائیں جو قدرتی پیداوار سے یہ لوگ خود تیار کرتے ہیں، مثلاً روٹی، سالن، مریٹے، اچار، پیٹیاں اور بے شمار دوسری چیزیں۔"

۵؎ ان مختصر فقروں میں زمین کی روئیدگی کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ آدمی شب و روز اس زمین کی

پیداوار کھا رہا ہے اور اپنے نزدیک اسے ایک معمولی بات سمجھتا ہے۔ لیکن اگر وہ غفلت کا پردہ چاک کر کے نگاہ غور سے دیکھے تو اسے معلوم ہو کہ اس فرشِ خاک سے لہبہاتی کھیتوں اور سرسبز باغوں کا اگنا اور اس کے اندر پتھروں اور نہروں کا رداں ہونا کوئی کھیل نہیں ہے جو آپ سے آپ ہوئے جا رہا ہو بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم حکمت و قدرت اور ربوبیت کا فرما ہے۔ زمین کی حقیقت پر غور کیجیے۔ جن مادوں سے یہ مرکب ہے اُن کے اندر بجائے خود کسی نشوونما کی طاقت نہیں ہے۔ یہ سب مادے فرداً فرداً بھی اور ہر ترکیب آمیزش کے بعد بھی بالکل غیر نامی ہیں اور اس بنا پر ان کے اندر زندگی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس بے جان زمین کے اندر سے نباتی زندگی کا ظہور آخر کیسے ممکن ہوا؟ اس کی تحقیق آپ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ چند بڑے بڑے اسباب ہیں جو اگر پیچے فراہم نہ کر دیئے گئے ہوتے تو یہ زندگی سرے سے وجود میں نہ آسکتی تھی۔

اولاً، زمین کے مخصوص خلوں میں اس کی اوپری سطح پر بہت سے ایسے مادوں کی تہ چڑھائی گئی جو نباتات کی غذا بننے کے لیے موزوں ہو سکتے تھے اور اس تہ کو نرم رکھا گیا تاکہ نباتات کی جڑیں اس میں پھیل کر اپنی غذا چوس سکیں۔

ثانیاً، زمین پر مختلف طریقوں سے پانی کی بہم رسانی کا انتظام کیا گیا تاکہ غذائی مادے اس میں تحلیل ہو کر اس قابل ہو جائیں کہ نباتات کی جڑیں ان کو جذب کر سکیں۔

ثالثاً، اوپر کی فضا میں ہوا پیدا کی گئی جو آفاتِ سادی سے زمین کی حفاظت کرتی ہے، جو بارش لانے کا ذریعہ بنتی ہے، امداد اپنے اندر وہ گیسیں بھی رکھتی ہے جو نباتات کی زندگی امداد کے نشوونما کے لیے درکار ہیں۔ رابعاً، سورج اور زمین کا تعلق اس طرح قائم کیا گیا کہ نباتات کو مناسب درجہ حرارت اور موزوں موسم مل سکیں۔

یہ چار بڑے بڑے اسباب (جو بجائے خود بے شمار ضمنی اسباب کا مجموعہ ہیں) جب پیدا کر دیئے گئے تب نباتات کا وجود میں آنا ممکن ہوا۔ پھر یہ سازگار حالات فراہم کرنے کے بعد نباتات پیدا کیے گئے اور ان میں سے ہر ایک کا تخم ایسا بنایا گیا کہ جب اسے مناسب زمین، پانی، ہوا اور موسم میسر آئے تو اس کے

زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوع انسانی) میں سے یا ان اشیاء میں
اندہ نباتی زندگی کی حرکت شروع ہو جاتے۔ مزید برآں اسی تخم میں یہ انتظام بھی کر دیا گیا کہ ہر نوع کے تخم سے
لازمًا اسی نوع کا بیٹا اپنی تمام نوعی اور موروثی خصوصیات کے ساتھ پیدا ہو۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر مزید
کاری گری یہ کی گئی کہ نباتات کی دس بیس یا سو پچاس نہیں بلکہ بے حد و حساب قسمیں پیدا کی گئیں اور ان کو اس
طرح بنایا گیا کہ وہ ان بے شمار اقسام کے حیوانات اور بنی آدم کی غذا، دوا، لباس اور ان گنت دوسری ضرورتوں
کو پورا کر سکیں جنہیں نباتات کے بعد زمین پر وجود میں لایا جانے والا تھا۔

اس حیرت انگیز انتظام پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ اگر مبٹ و حرمی اور تعصب میں مبتلا نہیں ہے تو
اس کا دل گواہی دے گا کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ نہیں ہو سکتا۔ اس میں صریح طور پر ایک حکیمانہ منصوبہ کام
کر رہا ہے جس کے تحت زمین، پانی، ہوا اور موسم کی مناسبتیں نباتات کے ساتھ، اور نباتات کی مناسبتیں
حیوانات اور انسانوں کی حاجات کے ساتھ انتہائی نزاکتوں اور باریکیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قائم کی گئی ہیں۔
کوئی ہوشمند انسان یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایسی ہمہ گیر مناسبتیں محض اتفاقی حادثہ کے طور پر قائم ہو سکتی ہیں پھر
یہی انتظام اس بات پر بھی ولالت کرتا ہے کہ یہ بہت سے خداؤں کا کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک ہی ایسے
خدا کا انتظام ہے اور ہو سکتا ہے جو زمین، ہوا، پانی، سورج، نباتات، حیوانات اور نوع انسانی، سب کا
خالق و رب ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے خدا الگ الگ ہوتے تو آخر کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ ایک
ایسا جامع، ہمہ گیر اور گہری حکیمانہ مناسبتیں رکھنے والا منصوبہ بن جاتا اور لاکھوں کروڑوں برس تک اتنی باقاعدگی
کے ساتھ چلتا رہتا۔

توحید کے حق میں یہ استدلال پیش کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَفَلَا تَشْكُرُونَ؟ یعنی کیا یہ لوگ ایسے
احسان فراموش اور نیک حرام ہیں کہ جس خدائے یہ سب کچھ سرور سامان ان کی زندگی کے لیے فراہم کیا ہے، اس کے
یہ شکر گزار نہیں ہوتے اور اس کی نعمتیں کھا کھا کر دوسروں کے شکر یہ ادا کرتے ہیں؟ اس کے آگے نہیں بھٹکتے اور ان بھوٹے
معبودوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں جنہوں نے ایک تنکا بھی ان کے لیے پیدا نہیں کیا ہے؟

نفلہ یعنی ہر شائبہ نقص و عیب سے پاک، ہر غلطی اور کمزوری سے پاک، اور اس بات سے پاک کہ کوئی

جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں۔

اس کا شریک و ہمیم ہو۔ مشرکین کے عقائد کی تردید کرتے ہوئے بالعموم قرآن مجید میں یہ الفاظ اس لیے استعمال کیے جاتے ہیں کہ شرک کا ہر عقیدہ اپنی حقیقت میں اللہ تعالیٰ پر کسی نہ کسی نقص اور کسی نہ کسی کمزوری اور عیب کا الزام ہے۔ اللہ کے لیے شرک تجویز کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایسی بات کہنے والا دراصل یہ سمجھتا ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ تنہا اپنی خدائی کا کام چلانے کے قابل نہیں ہے، یا وہ مجبور ہے کہ اپنی خدائی میں کسی دوسرے کو شریک کرے، یا کچھ دوسری بہتیاں آپ کے ایسی طاقت ور ہیں کہ وہ خدائی کے نظام میں دخل دے رہی ہیں اور خدا ان کی مداخلت برداشت کر رہا ہے، یا معاذ اللہ وہ انسانی بادشاہوں کی سی کمزوریاں رکھتا ہے جن کی بنا پر وزیروں، درباریوں، منہ چڑھے مصاحبوں اور چھپتے شہزادوں اور شہزادیوں کا ایک لشکر کا شکر ملے گھیرے ہوئے ہے اور خدائی کے بہت سے اختیارات ان کے درمیان بٹ کر رہ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ جاہلانہ تصورات اگر ذہنوں میں موجود نہ ہوتے تو سرے سے شرک کا خیال پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام عیوب و نقائص اور کمزوریوں سے پاک اور منزہ ہے جو مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

اسلئے یہ توحید کے حقی میں ایک اور استدلال ہے۔ اور یہاں پھر پیش پا افتادہ حقائق ہی میں سے بعض کو لے کر بتایا جا رہا ہے کہ شب و روز جن اشیاء کا تم مشاہدہ کرتے اور یونہی غم و غوض کیے بغیر گزر جاتے ہو انہی کے اندر حقیقت کا سراغ دینے والے نشانات موجود ہیں۔ عورت اور مرد کا جوڑ تو خود انسان کا اپنا سبب پیدائش ہے۔ حیوانات کی غلیں بھی نہ وہ مادہ کے ازدواج سے چل رہی ہیں۔ نباتات کے متعلق بھی انسان جانتا ہے کہ ان میں نزدیک کا اصول کام کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ بے جان مادوں تک میں مختلف اشیاء جب ایک دوسرے سے جوڑ لگاتی ہیں تب کہیں ان سے طرح طرح کے مرکبات وجود میں آتے ہیں۔ خود مادے کی بنیادی ترکیب منفی اور مثبت برقی توانائی کے ارتباط سے ہوئی ہے۔ یہ ترویج، جس کی بدولت یہ ساری کائنات وجود میں آئی ہے، حکمت و صناعت کی ایسی باریکیاں اور پیچیدگیاں رکھتی ہے اور اس کے اندر ہر دو ذریعہ کے درمیان ایسی مناسبتیں پائی جاتی ہیں کہ بے لاگ عقل رکھنے والا کوئی شخص نہ تو اس چیز کو ایک

ان کے لیے ایک اور نشانی رات ہے، ہم اُس کے اوپر سے دن بٹا دیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور سورج، وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ زبردست علیم اتفاقی حادثہ کہہ سکتا ہے اور نہ یہ مان سکتا ہے کہ مختلف خداؤں نے ان بے شمار ازدواج کو پیدا کر کے ان کے درمیان اس حکمت کے ساتھ جوڑ لگاٹے ہوں گے۔ ازدواج کا ایک دوسرے کے لیے جوڑ ہونا اور ان کے ازدواج سے نئی چیزوں کا پیدا ہونا خود وحدت خالق کی صریح دلیل ہے۔

۱۳۷ رات آمدن کی آمد و رفت بھی انہی پیش پا افتادہ حقائق میں سے ہے جنہیں انسان محض اس بنا پر کہ وہ معمولاً دنیا میں پیش آرہے ہیں، کسی التفات کا مستحق نہیں سمجھتا۔ حالانکہ اگر وہ اس بات پر غور کرے کہ دن کیسے گزرتا ہے اور رات کس طرح آتی ہے، آمدن کے جانے اور رات کے آنے میں کیا حکمتیں کار فرما ہیں تو اسے خود محسوس ہو جائے کہ یہ ایک رتبہ قدیر و حکیم کے وجود اور اس کی کینائی کی روشن دلیل ہے۔ دن کبھی نہیں جاسکتا اور رات کبھی نہیں آسکتی جب تک زمین کے سامنے سے سورج نہ بٹے۔ دن کے بٹنے اور رات کے آنے میں جو انتہائی باقاعدگی پائی جاتی ہے وہ اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ سورج اور زمین کو ایک ہی اٹل ضابطہ نے جکڑ رکھا ہو۔ پھر اس رات آمدن کی آمد و رفت کا جو گہرا تعلق زمین کی مخلوقات کے ساتھ پایا جاتا ہے وہ اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ کسی نے یہ نظام کمال درجے کی دانائی کے ساتھ بالارادہ قائم کیا ہے۔ زمین پر انسان اور حیوان اور نباتات کا وجود، بلکہ یہاں پانی اور ہوا اور مختلف معدنیات کا وجود بھی دراصل نتیجہ ہے اس بات کا کہ زمین کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے، اور پھر یہ انتظام کیا گیا ہے کہ زمین کے مختلف حصے تسلسل کے ساتھ مقرر وقفوں کے بعد سورج کے سامنے آتے اور اس کے سامنے سے بٹتے رہیں۔ اگر زمین کا فاصلہ سورج سے بہت کم یا بہت زیادہ ہوتا، یا اس کے ایک حصہ پر ہمیشہ رات رہتی اور دوسرے حصے پر ہمیشہ دن رہتا، یا شب و روز کا اٹل پھر بہت تیز یا بہت سست ہوتا، یا بے قاعدگی کے ساتھ اچانک کبھی دن کل آتا اور کبھی رات چھا جاتی، تو ان تمام صورتوں میں اس کرے پر کوئی زندگی ممکن نہ ہوتی، بلکہ غیر زندہ مادوں کی شکل و ہیئت بھی موجودہ شکل سے بہت مختلف ہوتی۔ دل کی آنکھیں بند نہ ہوں تو آدمی اس نظام کے اندر ایک ایسے خدا کی کار فرمائی صاف دیکھ سکتا ہے جس نے اس زمین پر اس خاص قسم کی مخلوقات کو وجود میں

ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔ اور چاند، اُس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ ان کے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو لٹنے کا ارادہ کیا اور ٹھیک ٹھیک اس کی ضروریات کے مطابق زمین اور سورج کے درمیان یہ نسبتیں قائم کیں خدا کا وجود اور اس کی توحید اگر کسی شخص کے نزدیک بعید از عقل ہے تو وہ خود ہی سوچ کر بتائے کہ اس کا ریگری کو بہت سے خداؤں کی طرف غسوب کرنا، یا یہ سمجھنا کہ کسی اندھے بہرے قانونِ قدرت کے تحت یہ سب کچھ آپ ہی آپ ہو گیا ہے کس قدر عقل سے بعید ہونا چاہیے۔ کسی ثبوت کے بغیر محض قیاس و گمان کی بنیاد پر جو شخص یہ دوسری سلسلہ نامتناہی توجہات مان سکتا ہے وہ جب یہ کہتا ہے کہ کائنات میں نظم اور حکمت اور مقصدیت کا پایا جانا خدا کے ہونے کا کافی ثبوت نہیں ہے تو ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ واقعی یہ شخص کسی نظریے یا عقیدے کو قبول کرنے کے لیے کسی درجے میں بھی، کافی یا ناکافی عقلی ثبوت کی ضرورت غسوس کرتا ہے۔

۳۳ ٹھکانے سے مراد وہ جگہ بھی ہو سکتی ہے جہاں جا کر سورج کو آخر کار ٹھیر جانا ہے اور وہ وقت بھی ہو سکتا ہے جب وہ ٹھیر جائے گا اس آیت کا صحیح مفہوم انسان اسی وقت متعین کر سکتا ہے جبکہ اسے کائنات کے حقائق کا ٹھیک ٹھیک علم حاصل ہو جائے لیکن انسانی علم کا سال یہ ہے کہ وہ ہر زمانہ میں بدلتا رہا، اور آج جو کچھ اسے بظاہر معلوم ہے اس کے بدل جانے کا بھی ہر وقت امکان ہے۔ سورج کے متعلق قدیم زمانے کے لوگ عینی مشاہدے کی بنا پر یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے پھر مزید تحقیق و مشاہدہ کے بعد یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ وہ اپنی جگہ ساکن ہے اور نظامِ شمسی کے سیارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں لیکن یہ نظریہ بھی مستقل ثابت نہ ہوا۔ بعد کے مشاہدات سے پتہ چلا کہ نہ صرف سورج، بلکہ وہ تمام تارے جن کو ثابت (FIXED STARS) کہا جاتا ہے، ایک رُخ پر چلے جا رہے ہیں ثبوت کی رفتار کا اندازہ ۱۰ سے لے کر ۱۰۰ میل فی سکند تک کیا گیا ہے۔ اور سورج کے متعلق موجودہ زمانہ کے ماہرینِ فلکیات کہتے ہیں کہ وہ اپنے پورے نظامِ شمسی کو لیے ہوئے ۲۰ کلو میٹر (تقریباً ۱۲ میل) فی سکند کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ (ملاحظہ ہوا ناسا کیلکولیٹریا بڑا نیک، لفظ "اسٹار" اور لفظ "سُن")۔

۳۴ یعنی مہینے کے دوران میں چاند کی گردش ہر روز بدلتی رہتی ہے ایک دن وہ ہلال بن کر طلوع ہوتا ہے

جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔

پھر روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ چودھویں رات کو بدر کا مل بن جاتا ہے۔ اس کے بعد روز گھٹتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ آخر کار پھر اپنی ابتدائی بلائی شکل پر واپس پہنچ جاتا ہے۔ یہ چکر لاکھوں برس سے پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے اور چاند کی ان مقرر منزلوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔ اسی وجہ سے انسان حساب لگا کر ہمیشہ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ کس روز چاند کس منزل میں ہوگا۔ اگر اس کی حرکت کسی ضابطہ کی پابند نہ ہوتی تو یہ حساب لگانا ممکن نہ ہوتا۔

۳۵ اس فقرے کے دو مطلب لیے جاسکتے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ سورج میں یہ طاقت نہیں ہے کہ چاند کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لے، یا خود اس کے مدار میں داخل ہو کر اس سے جا ملے۔ دوسرا یہ کہ جواوقات چاند کے طلوع و ظہور کے لیے مقرر کر دیئے گئے ہیں ان میں سورج کبھی نہیں آسکتا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ رات کو چاند چمک رہا ہو اور یکایک سورج افق پر آجائے۔

۳۶ یعنی ایسا بھی کبھی نہیں ہوتا کہ دن کی مقررہ مدت ختم ہونے سے پہلے رات آجائے اور جواوقات دن کی روشنی کے لیے مقرر ہیں ان میں وہ اپنی تاریکیاں لیے ہوئے یکایک آ موجود ہو۔

۳۷ فَلَاک کا لفظ عربی زبان میں سیاروں کے مدار (ORBIT) کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کا مفہوم سما (آسمان) کے مفہوم سے مختلف ہے۔ پھر یہ ارشاد کہ ”سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں“ چار تہیتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ ایک یہ کہ نہ صرف سورج اور چاند، بلکہ تمام تارے اور سیارے اور اجرام فلکی متحرک ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا فلک، یعنی ہر ایک کی حرکت کا راستہ یا مدار الگ ہے۔ تیسرے یہ کہ افلاک تاروں کو لیے ہوئے گردش نہیں کر رہے ہیں بلکہ تارے افلاک میں گردش کر رہے ہیں۔ اور چوتھے یہ کہ افلاک میں تاروں کی حرکت اس طرح ہو رہی ہے جیسے کسی سیال چیز میں کوئی شے تیر رہی ہو۔

ان آیات کا اصل مقصد علمِ ہدیت کے حقائق بیان کرنا نہیں ہے بلکہ انسان کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھے اور عقل سے کام لے تو زمین سے لیکر آسمان تک ہر جگہ وہ نگاہ ڈالے گا اس کے سامنے خدا کی ہستی اور اس کی یکتائی کے بے حد و حساب دلائل آئیں گے اور کہیں کوئی ایک دلیل بھی دہریت اور

ان کے لیے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کر دیا، اور پھر

شرک کے ثبوت میں نہ ملے گی۔ ہماری یہ زمین جس نظام شمسی میں شامل ہے اس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اس کا مرکز سورج توہین سے ۲ لاکھ گنا بڑا ہے، اور اس کے بعد ترین سیارے پلوچون کا فاصلہ سورج سے کم از کم ۲ ارب ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ اس عظمت کے باوجود یہ نظام شمسی ایک بہت بڑے کہکشاں کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہے جس کہکشاں

(GALAXY) میں ہمارا یہ نظام شمسی شامل ہے اس میں تقریباً ۳ ہزار ملین (۳ ارب) آفتاب پائے جاتے

ہیں، اور اس کا قریب ترین آفتاب ہماری زمین سے اس قدر دور ہے کہ اس کی روشنی یہاں تک پہنچنے میں ۴ سال صرف ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہکشاں بھی پوری کائنات نہیں ہے، بلکہ اب تک کے مشاہدات کی بنا پر اندازہ کیا گیا ہے

کہ یہ تقریباً ۲۰ لاکھ لویلی سماہیوں (SPIRAL NEBULAE) میں سے ایک ہے، اور ان میں سے قریب ترین

سماہیے کا فاصلہ ہم سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی روشنی ۱۰ لاکھ سال میں ہماری زمین تک پہنچتی ہے۔ یہ بعد ترین

اجرام فلکی جو ہمارے موجودہ آلات سے نظر آتے ہیں، ان کی روشنی تو زمین تک پہنچنے میں ۱۰ کروڑ سال لگ جاتے

ہیں۔ اس پر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انسان نے ساری کائنات دیکھ لی ہے۔ یہ خدا کی ندائی کا بہت تھوڑا سا حصہ

ہے جو اب تک انسانی مشاہدے میں آیا ہے۔ آگے نہیں کہا جاسکتا کہ مزید ذرائع مشاہدہ فراہم ہوتے پر اور کتنی

وسعتیں انسان پر منکشف ہوں گی۔

تمام معلومات جو اس وقت تک کائنات کے متعلق بہم پہنچی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پورا عالم

اسی مادے سے بنا ہوا ہے جس سے ہماری یہ چھوٹی سی ارضی دنیا بنی ہے اور اس کے اندر وہی ایک قانون کام

کر رہا ہے جو ہماری زمین کی دنیا میں کارفرما ہے، ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہم اس زمین پر بیٹھے ہوئے اتنی دوراز

کی دنیاؤں کے مشاہدے کرتے اور ان کے فاصلے ناپتے اور ان کی حرکات کے حساب لگاتے۔ کیا یہ اس بات کا

صریح ثبوت نہیں ہے کہ یہ ساری کائنات ایک ہی خدا کی تخلیق اور ایک ہی فرمانروا کی سلطنت ہے؟ پھر جو نظم،

جو حکمت، جو صناعتی، اور جو مناسبت ان لاکھوں کہکشاؤں اور ان کے اندر گھومنے والے اربوں تاروں اور سیاروں

میں پائی جاتی ہے اس کو دیکھ کر کیا کوئی صاحب عقل انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ آپکے آپ ہو گیا ہے؟

اس نظم کے پیچھے کوئی ناظم، اس حکمت کے پیچھے کوئی حکیم، اس صنعت کے پیچھے کوئی صانع، اور اس مناسبت کے

ان کے لیے ویسی ہی کشتیاں اور پیداکیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔ ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں، کوئی ان کی فریاد سننے والا نہ ہو اور کسی طرح یہ نہ بچائے جاسکیں۔ بس ہماری رحمت ہی ہے جو انہیں پار لگاتی اور ایک وقت خاص تک زندگی سے متمتع ہونے کا موقع دیتی ہے۔

پچھے کوئی منصوبہ ساز نہیں ہے !

۱۱؎ بھری ہوئی کشتی سے مراد ہے حضرت نوح کی کشتی۔ اور نسل انسانی کو اُس پر سوار کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کشتی میں بظاہر تو حضرت نوح کے چند ساتھی ہی بیٹھے ہوئے تھے مگر درحقیقت قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسان اس پر سوار تھے۔ کیونکہ طوفانِ نوح میں ان کے سوا باقی پوری اولادِ آدم کو غرق کر دیا گیا تھا اور بعد کی انسانی نسل صرف انہی کشتی والوں سے چلی۔

۱۲؎ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ تاریخ میں پہلی کشتی جو بنی وہ حضرت نوح والی کشتی تھی۔ اُس سے پہلے انسان کو دریاؤں اور سمندوں کے عبور کرنے کا کوئی طریقہ معلوم نہ تھا۔ اس طریقے کی تعلیم رب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو دی۔ اور جب اُن کی بنائی ہوئی کشتی پر سوار ہو کر اللہ کے کچھ بندے طوفان سے نکلے تو آئندہ ان کی نسل نے ہماری سفروں کے لیے کشتیاں بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

۱۳؎ پچھلی نشانیوں کا ذکر دلائلِ توحید کی حیثیت سے کیا گیا تھا، اور اس نشانی کا ذکر یہ احساس دلانے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ انسان کو فطرت کی طاقتوں پر تصرف کے جو اختیارات بھی حاصل ہیں وہ اللہ کے دیئے ہوئے ہیں، اُس کے اپنے حاصل کیے ہوئے نہیں ہیں۔ اور ان طاقتوں پر تصرف کے جو طریقے اس نے دریافت کیے ہیں وہ بھی اللہ کی رہنمائی سے اس کے علم میں آئے ہیں، اس کے اپنے معلوم کیے ہوئے نہیں ہیں۔ انسان کا اپنا بل بوتہ یہ نہ تھا کہ اپنے زور سے وہ ان عظیم طاقتوں کو مسخر کرتا اور نہ اس میں یہ صلاحیت تھی کہ خود اسرافِ فطرت کا پتہ چلا لیتا اور ان قوتوں سے کام لینے کے طریقے جان سکتا۔ پھر جن قوتوں پر بھی اللہ نے اس کو اقتدار عطا کیا ہے اُن پر اس کا قابو اسی وقت تک چلتا ہے جب تک اللہ کی مرضی یہ ہوتی ہے کہ وہ اُس کے لیے مسخر رہیں۔ ورنہ جب مرضی الہی کچھ اور ہوتی ہے تو وہی طاقتیں جو انسان کی خدمت میں لگی ہوتی ہیں، اچانک اس پر پلٹ پڑتی ہیں اور آدمی اپنے آپ کو ان کے سامنے بالکل

ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ پچو اُس انجام سے جو تمہارے آگے آ رہا ہے اور تمہارے پیچھے گزر چکا ہے، شاید کہ تم پر رحم کیا جائے (تو یہ سنی اُن سنی کر جاتے ہیں)۔ ان کے سامنے ان کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے یہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو رزق تمہیں عطا کیا ہے اُس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں بھی خرچ کر تو یہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے ایمان لانے والوں کو جواب دیتے ہیں کیا ہم اُن کو کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟ تم تو بالکل ہی بہک گئے ہو۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ”یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟ بتاؤ اگر تم سچے ہو۔“ اصل

بے بس پاتا ہے۔ اس حقیقت پر متنبہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بحری سفر کے معاملہ کو محض بطور نمونہ پیش کیا ہے۔ نوح انسانی پوری کی پوری طوفان میں ختم ہو جاتی اگر اللہ تعالیٰ کشتی بنانے کا طریقہ حضرت نوح کو نہ سکھادیتا اور اُن پر ایمان لانے والے لوگ اس میں سوار نہ ہو جاتے پھر نوح انسانی کے لیے تمام روئے زمین پر پھیلنا ہی وجہ سے ممکن ہوا کہ اللہ سے کشتی سازی کے اصولوں کا علم پا کر لوگ دریافوں اور سمندروں کو عبور کرنے کے لائق ہو گئے تھے۔ مگر اُس ابتدا سے چل کر آج کے عظیم انسان جہازوں کی تعمیر تک انسان نے جتنی کچھ ترقی کی ہے اور جہاز رانی کے فن میں جتنا کچھ بھی کمال حاصل کیا ہے اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ دیا اور سمندر، سب اس کے قابو میں آگئے ہیں اور ان پر اسے مکمل غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔ آج بھی خدا کا پانی نہا ہی کے قبضہ قدرت میں ہے اور جب وہ چاہتا ہے انسان کو اُس کے جہازوں سمیت اس میں غرق کر دیتا۔
۱۴۱ یعنی جو تم سے پہلے کی قومیں دیکھ چکی ہیں۔

۱۴۲ آیات سے مراد کتاب اللہ کی آیات بھی ہیں جن کے ذریعہ سے انسانوں کو نصیحت کی جاتی ہے اور وہ آیات بھی مراد ہیں جو آثار کائنات اور خود انسان کے وجود اور اس کی تاریخ میں موجود ہیں جو انسان کو عبرت دلاتی ہیں بشرطیکہ وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے تیار ہو۔

۱۴۳ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کفر نے صرف ان کی عقل ہی اندھ سی نہیں کی ہے بلکہ ان کی اخلاقی حس کو بھی مردہ کر دیا ہے۔ وہ نہ خدا کے بارے میں صحیح تفکر سے کام لیتے ہیں، نہ خلق کے ساتھ صحیح طرز عمل

یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکہ ہے جو یکایک انہیں عین اُس حالت میں دھم لے گا جب یہ (اپنے دنیوی معاملات میں) جھگڑ رہے ہوں گے، اور اُس وقت یہ وصیت تک نہ کر سکیں گے، نہ اپنے گھروں کو بیٹ سکیں گے۔ پھر ایک صور ٹھونکا جائے گا اور یکایک یہ اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے۔ گھبرا کر کہیں گے: ارے، یہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے پاس ہر نصیحت کا اُٹا جواب ہے۔ ہر گمراہی اور بداخلاقی کے لیے ایک اوندھا فلسفہ ہے۔ ہر بھلائی سے خوار کے لیے ایک گھڑا گھڑایا بہانا موجود ہے۔

۱۱۱۔ توحید کے بعد دوسرا مسئلہ جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے درمیان نزاع برپا تھی وہ آخرت کا مسئلہ تھا۔ اس کے متعلق عقلی دلائل تو آگے چل کر خاتمہ کلام پر دیئے گئے ہیں مگر دلائل دینی سے پہلے یہاں اس مسئلے کو لے کر عالم آخرت کا ایک عبرتناک نقشہ اُن کے سامنے کھینچا گیا ہے تاکہ انہیں یہ معلوم ہو کہ جس چیز کا وہ انکار کر رہے ہیں وہ ان کے انکار سے ٹٹنے والی نہیں ہے بلکہ لامحالہ ایک روز ان حالات سے انہیں دوچار ہونا ہے۔

۱۱۲۔ اس سوال کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ لوگ فی الواقع قیامت کے آنے کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے تھے، اور اگر مثلاً ان کو یہ بتا دیا جاتا کہ وہ فلاں سنہ میں فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو پیش آئیگی تو ان کا شک رفع ہو جاتا اور وہ اسے مان لیتے۔ دراصل اس طرح کے سوالات وہ محض کج بحثی کے لیے چیلنج کے انداز میں کرتے تھے اور اُن کا مدعا یہ کہنا تھا کہ کوئی قیامت، ویا مت نہیں آئی ہے، تم خواہ مخواہ سچیں اس کے ڈراوے دیتے ہو۔ اسی بنا پر ان کے جواب میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ قیامت فلاں روز آئے گی، بلکہ انہیں یہ بتایا گیا کہ وہ آئے گی اور اس شان سے آئے گی۔

۱۱۳۔ یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ قیامت آہستہ آہستہ آ رہی ہے اور لوگ دیکھ رہے ہیں کہ وہ آ رہی ہے۔ بلکہ وہ اس طرح آئے گی کہ لوگ پورے اطمینان کے ساتھ اپنی دنیا کے کاروبار چلا رہے ہیں اور ان کے حاشیہ خیال میں بھی یہ تصور موجود نہیں ہے کہ دنیا کے خاتمہ کی گھڑی آچکی ہے۔ اس حالت میں اچانک ایک زور کا کڑا کا ہوگا اور جو جہاں تھا وہیں دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔

کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اٹھا کھڑا کیا؟ یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمان نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کی بات سچی تھی۔ ایک ہی زور کی آواز ہوگی اور سب کے سب ہمارے سامنے حاضر

حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت ابو ہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ لوگ راستوں پر چل رہے ہونگے، بازاروں میں خرید و فروخت کر رہے ہونگے، اپنی مجلسوں میں بیٹھے گفتگو نہیں کر رہے ہونگے۔ ایسے میں یکایک صور پھونکا جائے گا۔ کوئی کپڑا خرید رہا تھا تو ساتھ سے کپڑا رکھنے کی نوبت نہ آئے گی کہ ختم ہو جائے گا۔ کوئی اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے لیے حوض بھرے گا اور ابھی پلانے نہ پائے گا کہ قیامت برپا ہو جائے گی۔ کوئی کھانا کھانے بیٹھے گا اور رقمہ اٹھا کر منہ تکے جانے کی بھی اسے مہلت نہ ملے گی۔

۱۱۷۔ صور کے متعلق تفصیلی کلام کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم، ص ۱۲۲۔ پہلے صور اور دوسرے صور کے درمیان کتنا زمانہ ہوگا، اس کے متعلق کوئی معلومات ہمیں حاصل نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ زمانہ سینکڑوں اور ہزاروں برس طویل ہو۔ حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اسرافیل صور پڑھنے رکھے عرش کی طرف دیکھ رہے ہیں اور منتظر ہیں کہ کب پھونک مارنے کا حکم ہوتا ہے۔ یہ صورتیں مرتبہ پھونکا جائے گا۔ پہلا نفثۃ الفزع، جو زمین و آسمان کی ساری مخلوق کو سہا دیگا۔ دوسرا نفثۃ الفسق جسے سنتے ہی سب ہلاک ہو کر گرے جائیں گے۔ پھر جب اللہ واحد و احد کے سوا کوئی باقی نہ رہے گا تو زمین بدل کر کچھ سے کچھ کر دی جائے گی اور اسے عکاسی بساط کی طرح ایسا پاٹ کر دیا جائے گا کہ اس میں کوئی ذرا سی سٹوٹ تک نہ رہے گی۔ پھر اللہ اپنی خلق کو بس ایک جھڑکی دیکھا جسے سنتے ہی ہر شخص جس جگہ مگر گرا تھا اسی جگہ وہ اس بدی ہوئی زمین پر اٹھ کھڑا ہوگا، اور یہی نفثۃ القیام رب العالمین ہے۔ اسی مضمون کی تائید قرآن مجید کے بھی متعدد اشارات سے ہوتی ہے مثلاً

۱۱۸۔ کے طور پر ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۲۹۲-۲۹۳۔ جلد سوم، ص ۱۲۴-۱۲۵۔

۱۱۹۔ یعنی اس وقت انہیں یہ احساس نہ ہوگا کہ وہ مر چکے تھے اور اب ایک مدت دراز کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گئے ہیں۔ بلکہ وہ اس خیال میں ہونگے کہ ہم سوئے پڑے تھے، اب یکایک کسی خوفناک حادثہ کی وجہ سے ہم جاگ اٹھے ہیں اور بھاگے جا رہے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم)

کر دیئے جائیں گے۔ آج کسی پرفتنہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا اور تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے عمل تم کرتے رہے تھے۔ آج جتنی لوگ مرے کرسم میں مشغول ہیں، وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں ہیں مسندوں پر تکیے لگائے ہوئے، ہر قسم کی لذیذ چیزیں کھانے پینے کو ان کے بسے وہاں موجود ہیں، جو کچھ وہ طلب کریں ان کے لیے حاضر ہے، رب رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہا گیا ہے۔ اور اُسے مجرمو آج تم چھٹ کر الگ ہو جاؤ آدم کے بچو، کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو،

۹ یہاں اس امر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ یہ جواب دینے والا کون ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دیر بعد خود انہی لوگوں کی سمجھ میں معاملہ کی اصل حقیقت آجائے اور وہ آپ ہی اپنے دلوں میں کہیں کہ ہائے ہماری کم نعتی، یہ تو وہی چیز ہے جس کی خبر خدا کے رسول ہیں دیتے تھے اور ہم اسے جھٹلایا کرتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل ایمان ان کی غلط فہمی رفع کریں اور ان کو بتائیں کہ یہ خواب سے بیداری نہیں بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جواب قیامت کا پورا ماحول ان کو دے رہا ہو، یا فرشتے ان کو حقیقت حال سے مطلع کریں۔

۱۰ یہ وہ خطاب ہے جو اللہ تعالیٰ کفار و مشرکین اور فاسق و مجرمین سے اُس وقت فرمائے گا جب وہ اُس کے سامنے حاضر کیے جائیں گے۔

۱۱ اس کلام کو سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ صالح اہل ایمان میدانِ حشر میں روک کر نہیں رکھے جائیں گے بلکہ ابتدا ہی میں ان کو بلا حساب، یا ہلکی حساب نہی کے بعد جنت میں بھیج دیا جائے گا، کیونکہ ان کا ریکارڈ صاف ہو گا۔ انہیں دورانِ عدالت انتظار کی تکلیف دینے کی کوئی ضرورت نہ ہو گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ میدانِ حشر میں جواب دہی کرنے والے مجرموں کو تیلے گا کہ دیکھو جن صالح لوگوں کو تم دنیا میں بے وقوف سمجھ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے، وہ اپنی عقلمندی کی بدولت آج جنت کے مزے لوٹ رہے ہیں، اور تم جو اپنے آپ کو بڑا زیرک و فرزانہ سمجھ رہے تھے، یہاں کھڑے اپنے جرائم کی جواب دہی کر رہے ہو۔

۱۲ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مومنین صالحین سے الگ ہو جاؤ، کیونکہ دنیا میں چاہے تم ان کی قوم اور ان کے کنبے اور برادری کے لوگ رہے ہو، مگر یہاں اب تمہارا اور ان کا کوئی رشتہ باقی نہیں ہے۔

وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، اور میری ہی بندگی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے؟ مگر اس کے باوجود اس نے اور دوسرا یہ کہ تم آپس میں الگ الگ ہو جاؤ۔ اب تمہارا کوئی جھگڑا قائم نہیں رہ سکتا۔ تمہاری سب پارٹیاں توڑ دی گئیں۔ تمہارے تمام رشتے اور تعلقات کاٹ دیئے گئے۔ تم میں سے ایک ایک شخص کو اب تمہارا اپنی فاتی حیثیت میں اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

لکھ یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے عبادت کو اطاعت کے معنی میں استعمال فرمایا ہے ہم اس سے پیچھے نصیب اللہ تعالیٰ میں متعدد مقامات پر اس مضمون کی تشریح کر چکے ہیں ملاحظہ ہو جلد اول، صفحات ۱۳۲-۳۹۸-۵۷۷-۵۷۸-۵۸۹-۵۹۰ جلد دوم، صفحات ۱۸۹-۲۸۳-۲۸۴-۲۸۵ جلد سوم، صفحات ۳۱-۶۹-۶۵۶- اور حواشی سورہ سبا، آیات ۴۱-۴۲ اس سلسلہ میں وہ نفیس بحث بھی قابل ملاحظہ ہے جو اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے امام رازی نے اپنی تفسیر میں فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "لا تعبدوا الشیطان کے معنی ہیں لا تطیعوہ" اس کی اطاعت نہ کرو، اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کو محض سجدہ کرنا ہی ممنوع نہیں ہے بلکہ اس کی اطاعت کرنا اور اس کے حکم کی تابعداری کرنا بھی ممنوع ہے۔ لہذا اطاعت عبادت ہے۔ اس کے بعد امام صاحب سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر عبادت بمعنی طاعت ہے تو کیا آیت "أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ" میں ہم کو رسول اور امراء کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے؟ پھر اس سوال کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ: "ان کی اطاعت جبکہ اللہ کے حکم سے ہو تو وہ اللہ ہی کی عبادت اور اسی کی طاعت ہوگی۔ یہی نہیں، بلکہ خود رکوع و سجود بھی اگر غیر کے سامنے اللہ کے حکم سے ہو تو وہ اللہ ہی کی عبادت ہوگی۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ ملائکہ نے اللہ کے حکم سے آدم کو سجدہ کیا اور یہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ تھی۔ امراء کی طاعت ان کی عبادت صرف اس صورت میں ہوگی جبکہ ایسے معاملات میں ان کی اطاعت کی جائے جن میں اللہ نے ان کی اطاعت کا اذن نہیں دیا ہے۔" پھر فرماتے ہیں: "اگر کوئی شخص تمہارے سامنے آئے اور تمہیں کسی چیز کا حکم دے تو دیکھو کہ اس کا یہ حکم اللہ کے حکم کے موافق ہے یا نہیں موافق نہ ہو تو شیطان اس شخص کے ساتھ ہے، اگر اس حالت میں تم نے اس کی اطاعت کی تو تم نے اس کی اور اس کے ساتھ شیطان کی عبادت کی۔ اسی طرح اگر تمہارا نفس تمہیں کسی کام کے کرنے پر اکسائے تو دیکھو کہ شرع کی رو سے وہ کام کرنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ اجازت نہ ہو تو تمہارا نفس خود شیطان ہے یا شیطان اس کے ساتھ

تم میں سے ایک گروہ کثیر کو گمراہ کر دیا کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے؟ یہ وہی جہنم ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا تھا جو کفر تم دنیا میں کرتے رہے ہو اس کی پاداش میں اب اس کا ایندھن بنو۔ آج ہم ان کے منہ بند کیے دیتے ہیں، ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ دنیا میں کیا کمائی کرتے رہے ہیں۔

ہے۔ اگر تم نے اس کی پیروی کی تو تم اس کی عبادت کے مرتکب ہو گے۔ آگے چل کر وہ پھر فرماتے ہیں: مگر شیطان کی عبادت کے مراتب مختلف ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام کرتا ہے اور اس کے اعضاء کے ساتھ اس کی زبان بھی اس کی موافقت کرتی ہے اور دل بھی اس میں شریک ہوتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اعضاء و جوارح سے تو آدمی ایک کام کرتا ہے مگر دل اور زبان اس کام میں شریک نہیں ہوتے بعض لوگ ایک گناہ کا ارتکاب اس حال میں کرتے ہیں کہ دل ان کا اس پر راضی نہیں ہوتا اور زبان ان کی اللہ سے مغفرت کر رہی ہوتی ہے اور وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم یہ بُرا کام کر رہے ہیں۔ یہ محض ظاہری اعضاء سے شیطان کی عبادت ہے کچھ اور لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ٹھنڈے دل سے جرم کرتے ہیں اور زبان سے بھی اپنے اس فعل پر خوشی و اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ظاہر و باطن دونوں میں شیطان کے عابد ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ۷- ص ۱۰۳-۱۰۴)

۵۴ یعنی اگر تم عقل سے محروم رکھے گئے ہو تو اور پھر اپنے رب کو چھوڑ کر اپنے دشمن کی بندگی کرتے تو تمہارے لیے عذر کی کوئی گنجائش تھی۔ لیکن تمہارے پاس تو خدا کی دی ہوئی عقل موجود تھی جس سے تم اپنی دنیا کے سارے کام چلا رہے تھے۔ اور تمہیں خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے متنبہ بھی کر دیا تھا اس پر بھی جب تم اپنے دشمن کے فریب میں آ گئے اور وہ تمہیں گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اپنی اس حماقت کی ذمہ داری سے تم کسی طرح بری نہیں ہو سکتے۔

۵۵: حکم اُن ہیڈ مجرموں کے معاملہ میں دیا جائے گا جو اپنے جرائم کا اقبال کرنے سے انکار کریں گے، گواہیوں کو بھی جھٹلا دیں گے، اور نامہ اعمال کی صحت بھی تسلیم نہ کریں گے۔ تب اللہ تعالیٰ حکم دیگا کہ اچھا، اپنی بکواس بند کر واد کیجھو کہ تمہارے اپنے اعضاء نے بدن تمہارے کرتوتوں کی کیا رواد سنائے ہیں۔ (اس سلسلہ میں یہاں

صرف ہاتھوں اور پاؤں کی شہادت کا ذکر فرمایا گیا ہے مگر دوسرے مقامات پر بتایا گیا ہے کہ ان کی آنکھیں ان کے کان، ان کی زبانیں اور ان کے جسم کی کھالیں بھی پوری داستان سنا دیں گی کہ وہ ان سے کیا کام لیتے رہے ہیں۔
 يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْاَشْيَاءُ فَاَيُّهُمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (النور - آیت ۲۴)۔ حَتَّىٰ اِذَا كُنَّا
 جَاوِزًا سَمِعْتُمْ عَلَيْهِمْ شَمْعَهُمْ وَابْصَارَهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (حکم المسجدہ - آیت ۲۰)۔
 یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ان کے منہ بند کر دیں گے، اور دوسری
 طرف سورہ نور کی آیت میں فرماتا ہے کہ ان کی زبانیں گوہری دیں گی، ان دونوں باتوں میں تطابق کیسے ہوگا؟
 اس کا جواب یہ ہے کہ منہ بند کر دینے سے مراد ان کا اختیار کلام سلب کر لینا ہے، یعنی اس کے بعد وہ
 اپنی زبان سے اپنی مرضی کے مطابق بات نہ کر سکیں گے۔ اور زبانوں کی شہادت سے مراد یہ ہے کہ ان کی
 زبانیں خود یہ داستان سنانا شروع کر دیں گی کہ ہم سے ان ظالموں نے کیا کام لیا تھا، کیسے کیسے کفر کیے تھے،
 کیا کیا جھوٹ بولے تھے، کیا کیا فتنے برپا کیے تھے، اور کس کس موقع پر انہوں نے ہمارے ذریعہ سے کیا
 باتیں کی تھیں۔

قارئین ”تفہیم القرآن“ توجہ فرمائیں

تفہیم القرآن جلد سوم کی اشاعت کے بعد اس کے قارئین کی جانب سے
 بالعموم ایک شکایت ناشر اور مولف کے نام آرہی ہے اور وہ یہ ہے کہ صفحہ ۲۸۶
 پر اُولَٰئِكَ يُسَادِعُونَ فِي الْخَيَوَاتِ وَهُمْ لَعَامًا يَبْعُونَ (آیت نمبر ۹۱، کا ترجمہ
 کتابت سے رہ گیا ہے۔ یہ شکایت صحیح نہیں ہے۔ اس آیت کا ترجمہ صفحہ ۲۸۳۔
 ۲۸۵ پر ان الفاظ میں موجود ہے۔ ”بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے اور سبقت
 کر کے انہیں پالنے والے تو وہ لوگ ہیں۔ یہ تقدیم و تاخیر محض اردو زبان کے محاورے
 اور ترجمانی میں نور پیدا کرنے کے لیے اختیار کی گئی ہے۔“